ایک روز سائرہ ہسپتال میں اُوپر پرائیویٹ کمرے میں آپ ریگولر معائنے کے بعد پروٹین ... ڈرپ لگوا رہے تھے۔ فزیشن ڈاکٹر فواد صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ کی دل سے متعلقہ ادویات میں کچھ ردّ و بدل ... ہے۔ کہنے لگے یہ دل کی دوائیوں والا نسخہ پروفیسر ڈاکٹر زبیر صاحب ہارٹ سپیشلسٹ کا ہے۔ ان کے مشورے ... اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میں نے جلدی جلدی زبیر صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ حسب وعدہ ایک آدھ ... سائرہ ہسپتال پہنچ گئے۔ ساری بات سنی اور ہنس کے کہنے لگے خاں صاحب یہ نسخہ تو میں نے آپ کو چھ سات ... دیا تھا۔ اشفاق صاحب نے کہا "جی ہاں! لیکن ان دوائیوں سے مجھے فائدہ ہے اس لیے میں اس وقت ... روزانہ لے رہا ہوں۔"

اُس دن بیگم اور میں صبح آٹھ بجے سے کچھ پہلے آپ کے کمرے میں پہنچے۔ تین دیواروں پر نہایت ... سے بچی ایک جیسے خاکی کاغذ میں لپٹی ایک جیسی سیاہی اور ایک ہی قلم سے مارک شدہ کتابیں آراستہ تھیں۔ جب ... نے اپنی بیگم کو اشفاق صاحب سے ملوایا تو وہ اتنی محنت اور باریک بینی سے محفوظ شدہ اس خزانے کو دیکھ کر خاموش ... کہہ اُٹھی کہ واہ کتنے سلیقہ اور شائستگی سے یہ کام کیا گیا ہے۔ اشفاق صاحب نے اسے بتایا کہ یہ کام انہوں نے ... سے کیا ہے۔ سیمنٹ کے تھیلوں کو صاف کر کے ان سے یہ کتاب پوش بنائے ہیں اور بازار سے کافی سارے ایک ... لیے تھے کہ تحریر بھی مماثل رہے۔

اس کمرے میں سامنے میز کرسی اور آپ کا قلمدان آراستہ تھا۔ دو اطراف صوفے اور ایک جانب ... کے لیے گدا پڑا تھا۔ اشفاق صاحب کا بستر ان کتابوں کے زیرِ سایہ مغرب کی جانب لگا تھا جس کی پائنتی کی ... چسپاں خسرو کا ایک شعر دریائے محبت کی اُلٹی روشوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ آپ سفید کرتا پہنے اور سفید چادر ... فرما رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے "عاطف میاں! رات تکلیف ذرا زیادہ ہوگئی اور تمہاری آپا کو ... آپ کو پیٹ میں شدید درد تھی اور پسینے اتنے چھوٹ رہے تھے کہ آپ کے کپڑے شرابور تھے۔ آپ کا جسم ... کے کسی بھی حصہ میں کوئی بھی نبض محسوس نہ ہو رہی تھی۔ مگر آپ بقائم ہوش و حواس گفتگو کر رہے تھے۔ گرمی ... ہوئے آپ نے بانو آپا سے کہا کہ اے سی چلا دو۔ پھر چند منٹ بعد پنکھا بند کر دینے کو کہا۔ میں نے بہتر ... ہسپتال شفٹ کروں۔

سائرہ ہسپتال فون کر کے میں نے ایمبولینس منگوائی اور خود درد کا ٹیکہ لینے داستان سرائے سے ... غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری بیگم سے کہا "آج ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں کیوں اتنی جلدی ... سے ناشتہ کر کے نہا دھو کے ہسپتال چلتے۔" پانچ آٹھ منٹ میں ایمبولینس بھی پہنچ گئی اور میں ٹیکہ بھی لے آیا ... بازو خود میری طرف بڑھایا اور قمیض کا بازو اُوپر کرنے لگے۔ اس اثنا میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے ... میں ٹائی پکڑے کمرے میں آگئے۔ وہ اپنے بینک جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

درد کا ٹیکہ لگنے کے بعد آپ کے دونوں محبتی خدمت گزاروں نے آپ کو ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا ... کے عملے کے ساتھ آپ کو اُٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایمبولینس کچھ تو ویسے ہی اُونچی تھی اور کچھ اس ...

اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دشوار تھا۔ ساتھ ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا اس میں چلے سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب کو دراز کیا۔ اب وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سے انہیں سہارا دیا۔ پھر بانو آپا نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کے پیچھے میں تھام لیا۔ ہم داستان سرائے سے ماڈل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کچھ دائیں جانب کو

آخری مہینوں میں انتہائی نقاہت کے باوجود آپ نے مطالعہ کی عادت ترک نہ کی تھی۔ ''طلسم ہوشربا'' پڑھتے تھی مگر ہلکے پھلکے رسالے پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں ''ریڈرز ڈائجسٹ'' پڑھتے میں نے انہیں کئی بار دیکھا۔ اس میں کہانی مختصر ہوتی ہے۔ میں ایک آدھ نشست میں پڑھ لیتا ہوں۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے اور بین الاقوامی حالات پر گہری نگاہ رکھتے۔

جب حکومت نے ''پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگوایا گیا تو اشفاق صاحب نے اس سوچ پر سخت ناپسندیدگی اور کیا۔ فرماتے تھے ''اس طرح تو میں نعرہ لگاؤں پہلے لاہور یا پہلے ماڈل ٹاؤن۔ یہ ایک غلط اور منفی سوچ ہے۔ میر صادق والی سوچ ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے سانجھے دشمن کے ساتھ مل کے اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں ہو دو اور دشمن بھی ایسا کہ جس کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قرآن میں فیصلہ صادر فرما دیا ہو کہ وہ تمہارا خیر خواہ اور ہو سکتا۔''

دنیائے اسلام کے حالات دیکھ کر اشفاق صاحب دل ہی دل میں بہت کڑھتے تھے۔ عراق، فلسطین اور کشمیر و کے دن شہید کر دیے جانے والوں کا حساب کر کے مجھے گنواتے کہ آج اتنے مسلمان شہید ہوئے اور آج سے ملاقات کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ہلاکت خیز اور آفت انگیز حالات سے مسلمانوں کا نکلنا صرف اسی ہے کہ انہیں ایک عاقبت اندیش، باوقار اور پُرنور رہنما مل جائے۔ وہ ہر ملاقات میں آغا جی سے پوچھتے عالم کب ہوگی؟ امام مہدی کا ظہور کب ہوگا؟

وصال سے ہفتہ دس دن پہلے آپ کی آغا جی سے آخری ملاقات ہوئی۔ اشفاق صاحب نے نہایت رنج و سے پوچھا ''دیکھیں آغا جی! اب تو اسرائیل اور امریکہ شام میں بھی گھسنے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' آغا جی ہنس نے لگے ''شام پر حملے کا تو ہمیں انتظار ہے۔ شام میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں۔ جب آنحضرت ﷺ کے مطابق شام پر حملہ ہوگا تو یہ چالیس ابدال اکٹھے ہو کر اللہ سے فریاد کریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نجات دہندہ بھیجے گا۔'' اشفاق صاحب تسلی میں آ گئے اور سر تکیے پر رکھ کے مطمئن ہو کر لیٹ گئے۔

ہسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے آپ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پہ آپ کو رکھا اور بانو آپا نے بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے گال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سائرہ طرف مڑے تو اشفاق صاحب کا بایاں ہاتھ آپا کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپا کو گمان گزرا کہ آخری سفر

یہ گمان اور خیال بھی خوب ہوتے ہیں۔ اشفاق صاحب ایک بار کہنے لگے یہ خیالات بھی بڑی بے زور شے ہیں۔ انہیں لگام دینا بڑا مشکل فعل ہے۔ میں نے ہاں میں ہاں ملائی کہ ہاں جی یہ سوچیں ہی ہمیشہ مروانی ہیں پوچھا کیا ہمارے خیالات اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہیں؟ ذرا تنک مزاجی سے جواب آیا "چھوڑو جی! اس کے کنٹرول اس کے اپنے خیالات بھی نہیں ہیں۔"

بانو آپا اور اشفاق صاحب کی جوڑی بھی کمال جوڑی تھی۔ ان کا آپس کا پیار محبت اور ادب و لحاظ نہیں مثالی بھی تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ان میں کون طالب ہے اور کون مطلوب۔ کبھی بانو آپا انہیں ایک پل کو سے انکاری نظر آتیں اور کبھی اشفاق صاحب کو میں یہ کہتے سنتا کہ کیا کمال کی خاتون ہے۔ اور آپا کے ناول "راجہ تعریف میں تو میں نے اکثر سنا کہ آپ اسے اردو ادب کا ایک نہایت ہی زوردار ناول گردانتے۔

اشفاق صاحب سناتے تھے کہ ایک بار وہ اپنے بابا جی سے بحث میں اُلجھ گئے۔ کہتے تھے کہ میں ان سوال جواب کرتا تھا۔ بابا جی ان کو سمجھا رہے تھے کہ دنیا میں کوئی چیز ساکت نہیں۔ یہ سورج، چاند ستارے سب محور میں گھوم رہے ہیں اور اشفاق صاحب بضد تھے کہ جدید سائنس کی رو سے سورج ساکت ہے اور زمین اس کے ہے۔ بابا جی نے آخر کہا اشفاق میاں! صرف مطلوب ساکت ہوتا ہے۔ سب طالب اس کے گرد گھومتے ہیں صاحب کہتے تھے میں جدید دنیا کا رہنے والا پڑھا لکھا انسان تھا، جو سائنس کی ترقی سے بھی خوب واقفیت رکھتا بابا جی کی یہ دلیل جو انہوں نے قرآن اور تصوف کی روشنی میں دی تھی، قبول تو نہ کی مگر طالب اور مطلوب کی نسبت بہت پسند آیا۔ کہتے ہیں گھر پہنچا تو ایک جدید سائنسی جریدہ کے سرورق پر درج تھا کہ سائنس نے یہ راز پا لیا ساکت نہیں اور ہر لحظہ گردش میں ہے۔

ساڑھے آٹھ سے تھوڑا اوپر ہم سائرہ ہسپتال پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بمشکل ویل چیئر پر بٹھا میں پہنچا دیا۔ بانو آپا ساتھ تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے آفس میں تشریف رکھیں اشفاق صاحب کی طرف دیکھا وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا اور کہا۔ پھر دوبارہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے وہ میری بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر فواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی۔ سکرین پر ایک سندیسہ دے رہی تھی کہ طالب نے مطلوب کو پالیا ہے اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوف رقیباں عاشق دراز ہو۔ کوئی شکن چہرے پر نہ تھی۔ اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اٹل تجربہ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں

اور اشفاق صاحب نے تو ایک عمر اولیائے کرام کے درمیان گزاری تھی۔ مجھ سے کئی بار فرمایا اُلجھنوں کا حل کبھی کسی صوفی اور کبھی کسی درویش بابا کے چرنوں میں بیٹھ کر ملا۔ صوفیائے کرام کے عرس کے قصے اکثر سناتے اور وہاں سے فیض حاصل ہونے کا اعتراف کرتے۔ ایک روز فرمانے لگے "عاطف میاں تھیوری ہے۔ جو تھیوری کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان حاکم رہے

یں اور مسلمان ملتے ہیں، سوائے سپین کے۔ باوجودیکہ سپین پر مسلمانوں نے آٹھ صدیاں حکومت کی، آج وہاں کوئی نے والا نہیں۔ حالانکہ علم و ادب اور سائنسی ترقی کے حساب سے سپین ایک بہت ترقی یافتہ سوسائٹی تھی اور جدید دنیا استوار کرنے میں سپین کے مسلمانوں کی خدمات بے مثل اور دیرپا تھیں۔" میں نے کہا یہ تو سچ ہے۔ کہنے لگے ے مسلمانوں کے نام و نشان ملیامیٹ ہو جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سائنسی ترقی و تمدن میں کسی سے پیچھے تھے بلکہ یہ کوئی صوفی کوئی پیر کوئی ولی کوئی بابا کبھی پیدا نہ ہوا اور نہ ہی وہاں رہا بسا۔"

اشفاق صاحب معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے ضمن میں بابوں اور درویشوں کی انمول خدمات کا ذکر اکثر مجھ ے۔ وہ زمانہ شناس صوفی تھے۔ دورِ حاضر کی ضروریات سے آگاہ اور درویشی اور تصوف کی حقیقتوں سے بہرہ مند۔ تھے کہ اسلام دشمن عناصر نے مسلمان کو قابو کرنے کے لیے اس انسان دوست مذہب کی بنیادوں پر پچھلی کئی سے کاری ضربیں لگائی ہیں اور اس واسطے خانقاہوں اور روحانی پیشواؤں کو خصوصی طور پر نشانہ ہی نہیں بنایا بلکہ کئی دو غلے امام اور ڈبہ پیر کھڑے کر دیے۔ یہی نہیں بلکہ جعلی نبی بھی بنا کر پیش کر دیے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔ جب انگریز اس ملک میں آئے تو 1860ء جگ انہوں نے ایک کمیشن بٹھایا کہ کس طرح مسلمانوں کو قابو کیا جا سکتا ہے اور اس کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی روحانی خانقاہوں کو نشانہ بنایا جائے۔ کہتے تھے دیکھو یہ چال اس قدر کامیاب رہی ہے کہ نے "خلیفہ"، "مولوی"، "پیر" اور "مرشد" جیسے پاکیزہ القاب کے معنی تک بدل کے رکھ دیے ہیں۔ شاید یہی وجہ اپنی گفتگو اور تحریر میں تصوف اور روحانیت کے ٹھوس اور پُر حقیقت بنیادی پیغامات اور اسباق کو آسان فہم کہانی کے ڈھال کر ماڈرن طریقہ پر پیش کرتے تھے۔

ذکر اور مراقبہ پر ایک روز گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے صرف مرشد ہی انسان کو ذکر منتقل کر سکتا ہے اور اس کے دل کو سکتا ہے اور ہمہ تن مراقبہ کے لیے تصورِ شیخ لازمی ہے۔ میں نے فوراً پوچھا تو آپ نے "زاویہ" میں مراقبے پر کے دوران یہ بات کیوں چھپا کر بیان کی اور مرشد کا ذکر تک نہ کیا۔ آپ سوچ میں پڑ گئے اور چند لمحوں بعد فرمانے بار اب جب اللہ نے موقع دیا تو یہ بات بھی صاف لوگوں تک پہنچاؤں گا۔"

مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اشفاق صاحب کے وصال کی خبر بانو آپا تک پہنچا سکوں۔ میں اثیر احمد صاحب کا کرنے لگا۔ وہ بینک کی کنجیاں دفتر پہنچا کر نو بجے کے قریب ہسپتال پہنچے اور انہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کو یہ خبر دی۔

نہ کوئی زلزلہ آیا اور نہ کوئی طوفان ہی اُٹھا۔ نہایت تحمل و بردباری سے وہ شفقت و ممتا اور پیار و محبت کی دیوی، جیسی تعالیٰ صدیوں میں کوئی ایک ہی بنا کر اس جہانِ فانی میں کریمانہ بھیجتا ہے، اپنے صاف و شفاف سفید لبادے میں سائرہ ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوئی۔ آپ نے اپنے طالب و مطلوب کی جانب ایک نگاہِ مشفقانہ ڈالی، جو بے سفید چادر میں لپٹا احساسات کے عالمِ غیب میں رونق افروز ہو چکا تھا۔ نہ کوئی شکوہ ہوا نہ کوئی شکایت۔ نہ زبان نے دی نہ آنکھ میں آنسو آیا۔ وہ خاموشی سے اس پاکیزہ جسدِ خاکی کے پاس آئیں اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے پاؤں تھام کر اسے چند لمحے تکتی رہیں۔ لبوں نے جنبش کی اور آپ نے ان قدموں کا بوسہ لیا اور پھر ان قدموں کو اپنی

آنکھوں سے لگا لیا اور ساتھ پڑی ہوئی کرسی کے دامن میں اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔

خسرو دریا پریم کا اُلٹی واہ کی دھار
جو اُبھرا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار

''ناں ناں..... ڈاکٹر عاطف آ گئے ہیں تم بینک جاؤ۔ تمہارے پاس لاکر کی چابیاں ہیں تمہیں لے جانا چاہئے۔''

اشیر خاں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہر بیماری میں ہمارے ساتھ ہسپتالوں میں رہا لیکن ساتھ ہی اُس کی بات کبھی کاٹی نہ تھی۔ اشیر کی کار اور ڈاکٹر عاطف کی کار پھاٹک سے نکلتے ہی ایک دائیں اور ایک بائیں مڑ گئیں۔

خاں صاحب راضی برضا بندے کی طرح مطمئن سیٹ سے کمر لگائے بیٹھے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر اُن کے گلے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اُن کی آواز گو دھیمی تھی لیکن نہ اُن کے حواس پراگندہ ہوئے نہ اُنہوں نے اپنے سے بچھڑنے ہی کا احساس دلایا۔

چھ ستمبر کی رات اُن کے صبر کی تصویر تھی۔ اُن کے درد کا یہ عالم تھا کہ بار بار چہرہ اس درد کا شاکی ہو جاتا میں اسی درد کے باعث خوف اور پریشانی لکھی تھی لیکن برداشت کا یہ عالم تھا کہ کسی حرکت' آواز اور اشارے سے انداز کی حالت کا اظہار نہ کیا۔

پاسپورٹ بن چکا تھا
ویزہ لگ چکا تھا
ٹکٹ' بیگیج چیک ہو چکا تھا۔

اُنہیں شاید سیٹ نمبر بھی معلوم تھا' لیکن اُنہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر اُن کا سر ڈھلک گیا۔ وہ اپنے بے جان ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپاتے رہے..... وہ اپنے گھر جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔

داستان سرائے سے سائرہ ہسپتال تک کا راستہ دُور نہ تھا۔ راستے میں درخت' پرندے' سڑک سب الوداع کہہ رہے تھے۔ جونہی کار رکی وہیل چیئر پر اُنہیں بٹھایا گیا..... میں اُن کے ساتھ تھی۔ پھر سسٹر مجھے ڈاکٹر کے حکم کے مطابق ڈاکٹر کے دفتر میں لے گئی۔

''آپ پلیز یہاں بیٹھیں..... ہم اُنہیں آکسیجن لگانے لگے ہیں۔''

اس وقت میں نے دو رکعت نفل پڑھے..... خاں صاحب کہتے تھے جب بھی کوئی لمبے سفر پر روانہ ہو شکرانے کے دو نفل ضرور گزارنے چاہئیں کہ اللہ میاں کا مال واپس کرتے وقت نہ جھگڑا ہو نہ تقاضا' نہ ندامت ہو نہ پچھتاوا۔ حقدار کے سپرد کرنے کے بعد کسی قسم کا ملال نہ ہونا چاہیے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنی والدہ کی رخصتی کے وقت پڑھے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنے بھائی کے جانے کے وقت پڑھے تھے۔

علیم مطلق جانتا ہے کب اور کس وقت کس کی روانگی موزوں، برحق اور پردہ پوش ہے۔

دفتر میں سسٹر طاہرہ اندر آئی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے گئی۔

وہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں موندے ہوئے لیٹے تھے۔ اُن کی ڈرپ ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ انیس اور اشیر اُن کی ...رے تھے۔ نہ جانے کب اور کیسے ڈاکٹر صاحب نے انہیں راستوں ہی سے بلا لیا تھا۔ مجھے خاں صاحب کی حاشیہ ...ے چھٹی مل گئی تھی۔ اُنہوں نے مجھے برطرف کر دیا تھا اور کوئی سفارشی خط بھی لکھ کر نہیں دیا تھا کہ میں کسی اور جگہ اسامی ...تی۔

یوں لگتا تھا واپسی کے جہاز میں وہ اس وقت اپنی سیٹ بیلٹ باندھ رہے تھے۔ لاہور کا منظر چھوٹے چھوٹے ...ے ہرے قطعوں اور بے مصرف سوئی ہوئی سڑکوں سے اُوپر جا رہا تھا۔ پچھلے منظر دھندلا رہے تھے۔

ایئر ہوسٹس نے بڑی توجہ سے پوچھا ہوگا ''اشفاق صاحب شرابِ طہورہ کہ کوئی زمینی مشروب؟''

اشفاق صاحب نے اپنی براؤن آنکھیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی پلکیں گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ Eye con... سے گھبراتی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے متعلق خاں صاحب نے سنا تھا کہ وہ خیموں میں مستور ہیں۔ اُن کو نہ ...جن نے ہاتھ لگایا نہ کسی انسان نے ہی۔

شاید اُنہیں اس شہر، اس کے رہنے والوں سے بچھڑنے کا اتنا غم نہ تھا جس قدر گھر جانے کی خوشی تھی!

کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے گھر کو جائیں گے
کب روئیں گے اور گائیں گے
کب چین کی بنسی باجے گی
ہم اپنا گیت سنائیں گے
ہم اپنا گیت سنائیں گے
کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے در کو جائیں گے؟

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ گیلی مٹی سے ...ٹ کی پٹڑی بمشکل تمام چھ انچ اُونچی تھی۔ کار سے نکلنے اور پٹڑی پر پاؤں دھرنے میں کچھ ایسی ناہمواری تھی یا جسم ...متوازن ہو گیا تھا کہ ذرا سا پاؤں رپٹا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔

اسے ہی غالباً ستھا کال کہتے ہیں کہ ہونی اپنے حملے کے صرف بہانے ڈھونڈتی ہے۔ ذرا سی چوک ہوا اور وار ...ے..... شاید اسی کے لیے بابے کہتے ہیں کہ ہونی ٹلا نہیں کرتی۔ اُسے چاہے راکھی باندھو بھلے رادھا بناؤ۔ وہ ڈیوڑھی ...میں بھی جھوٹی چوکی بھرتی ہے۔ اِدھر کوئی چوکا اُدھر اُس نے اپنا وار کیا۔

ہونی کو ٹالنے والی ایک تو آیت الکرسی تیر بہدف ہوا کرتی ہے' دوسرے کسی چاہنے والے کی دُعا۔۔۔ [illegible]
صاحب کہا کرتے تھے کچھ صاحب دُعا ایسے بابرکت ہوتے ہیں کہ اُن کی خیرخواہی کی خواہش ہی کن فیکون بن جاتی [illegible]
اِدھر انہوں نے wish کیا اُدھر willing کا معجزہ ہو گیا۔

میری والدہ بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا سارا اسلام آیت الکرسی ہے..... میں نے ساری بیوگی اسی کے
سہارے کاٹی۔ اپنے بچوں کو اسی کے سپرد کر کے نوکری کی۔ دورے کیے' اکیلی ریسٹ ہاؤسز میں رہی۔ اسی کا جپ [illegible]
کرتی میں رات کو بارہ بارہ بجے زمینوں پر اکیلی پہنچ جاتی تھی۔ لاہور والی بس مجھے پکی سڑک پر اتارتی۔ میں [illegible]
فاصلہ اسی آیت الکرسی کے سہارے چلتی۔ راستے میں گیدڑ' بھگیاڑ' سانپ سپولیے' جنگلی بے بھولے بھٹکے [illegible]
کبھی راہ چلتے دیوانے راہ پر ملتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ کبھی کسی نے نہ ان پر حملہ کیا نہ قریب آنے کی جرأت
کی..... سب آیت الکرسی کی بدولت۔

غالباً اس روز نہ تو کسی چاہنے والے نے ان کے لیے دعا کی تھی نہ ہمارے گھر میں کوئی آیت الکرسی کا [illegible]
موجود تھا۔ بس خاں صاحب ذرا سے ڈولے اور پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہڈی ٹوٹنے کے بعد وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں [illegible]
دبائے بڑے صبر سے اندر چلے آئے۔ بس ایک بار وہ خاموشی سے آدھی رات کو اٹھے۔ زیرو کے روشن بلب کی روشنی [illegible]
ذرا سا لڑکھڑا کر غسلخانے کی طرف گئے۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے دیوار سے لٹکے ریک پر سے کوئی دوا نکالی جیسے کوئی سلیپنگ پل نگل [illegible]
چلا..... فلش چلنے کی آواز نہ آئی۔ میں نے پتا لگایا کہ غالباً انہوں نے گولی نگلی اور ذرا سا ڈولتے ہوئے واپس
آئے..... نیند کی گولی نے اثر دکھایا۔ صبح قریب تھی جب وہ گھوک سو گئے۔

خاں صاحب چپکے چپکے اپنا علاج کرنے کے عادی تھے۔ وہ کسی ڈاکٹر کو بھی اپنا پورا حال سمجھاتے ہوئے [illegible]
رہتے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ خاں صاحب ذاتی سطح پر بڑی Privacy کے قائل ہیں [illegible]
چھوٹی چھوٹی چیزیں' ننھی منی خوشیاں' سسکتی ہوئی خواہشیں' بار بار ابھرنے والی نارسائیاں' پھڈا ڈالنے والے [illegible]
پراندے کی طرح لٹکنے والے غم سب کو اپنے صبر کے خوان پوش سے ڈھانپے رکھتے۔

وہ اُن کے بھائی بہن بچپن کی باتیں دیہات میں گزرے ہوئے واقعات' اُن دنوں کی ملاقاتوں کا ذکر [illegible]
سی تفصیل کے فرق سے یوں بیان کرتے ہیں گویا بیت المال سے رقم لے رہے ہوں۔ ان واقعات کے بیان میں [illegible]
نہیں کوئی شرمندگی نہیں۔ ڈھکا چھپا فخر' حیرت افزا یادیں جو ایک ہی پنڈورا بکس سے نکلتی ہیں۔ یہ ایک خزانہ عامرہ ہے جس
سے سب بھائی بہن بلاتکلف فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سب یادیں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سن لیں آپ کو لگے
کہ یہ واقعہ اُسی کی میراث ہے۔

خاں صاحب جب بھی ان یادوں کا پٹارا کھولتے' قلم اور کاغذ پر کہانی کے رُوپ میں ڈرامہ کی صورت [illegible]
شکل میں وہ اپنے سننے والے' پڑھنے والے' ناظرین تک بخوبی پہنچ جاتے بلکہ ان کہانیوں سے ''گڈریا'' جیسی کہانیاں
لیتیں' ڈرامہ ''قرۃ العین'' وجود میں آتا۔ ''زاویہ'' کی شہرت دُور دُور تک پہنچ پائی لیکن یہ دُور مار کارتوس اور تھے [illegible]

تیں تھیں، جو اُن کے اپنے اندر پھیلی تھیں اور زمین دوز تھیں۔ ان میں سے جب کوئی سرنگ پھٹتی تو خاں صاحب تے، گر پڑتے ہڈی ٹوٹ جاتی' آپریشن کرانا پڑتا۔ گھٹنے تک ٹانگ پلستر میں چلی جاتی، لیکن وہ اس اندرونی بھول کی کو نہ چلنے دیتے۔

خاں صاحب میں شادی کے بعد ایک واضح فرق آ چکا تھا۔ شادی سے پہلے جب تک میں دوری پر تھی وہ اپنی مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لمحہ لمحہ کا' قطرہ قطرہ کا حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے روم سے جو خط لکھتے رہے وہ اس تکمیل ہیں کہ یہ عہد بے نقاب ہونے کا تھا۔ ہر منصوبہ' حرکت' سوچ' عمل' مجھ تک نیلی گرافک انداز میں ترسیل کا عہد تھا۔

شادی کے بعد انہیں خیال تھا کہ بیوی زیادہ سچ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بیوی کو اللہ نے حسد کے خمیر اور شوہر کو بے سوڑا بائی کا رب سے گوندا ہے۔ وہ سچ جو محبوب کی انا کو تسکین دیتے ہیں' بیوی کی انا کو ٹھوکر لگا سکتے ہیں۔

عورت ہمیشہ مرد کی محبوبہ رہنے پر اصرار کرتی ہے اور شوہر کچھ اپنی جبلی کمزوری کے باعث کچھ کمانے اور کفالت داریوں سے تھک کر کچھ عورت کے عمر ڈھلنے کے باعث عاشق کا رول اچھی طرح ادا کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ یہاں جھول پڑ جاتے ہیں۔ اللہ نے مرد کو کھیتی میں بیج ڈالنے پر مامور کر رکھا ہے۔ وہ زمین رہتلی ہو' بنجر ہو' ہریاول سے لدی جائے آئے' پولن کی شکل میں بار آور کرے' مرد کی جبلت ہی خدا نے ایسی بنائی ہے۔

اگر مرد صرف خوبصورت عورت سے ہی ہم بستری کر سکتا تو شہر میں گنتی کی ماہ پارہ عورتیں ہی بچوں کو گود کھلاتیں۔ بیج بونے کے معاملے میں قدرت نے ایسا اندھا بنایا ہے کہ موٹی' ٹھگنی' بوڑھی' معذور حتیٰ کہ بسا اوقات دیوانی عورتیں مشیت کے مطابق اسی کم عقل' بے وفا' ہرجائی چک سے بار آور ہو جاتی ہیں۔ یہ آفرینش کی پلاننگ ہے کہ دھرتی پر مخلوق رہے۔ وفا پر بے وفائی غالب آتی رہے۔ کھیتیاں ہری ہوتی رہیں اور باقی رہے نام اللہ کا۔

ادھر عورت ہمیشہ کسی ایک کی ہو رہنے اور کسی ایک کو اپنا کر رکھنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس خواب کا مرکز اُس کی ذات رہتی ہے۔ اسی برس کی بڑھیا بھی اپنے حسن کے کرشمے بیان کرتے نہیں تھکتی۔ بڑھاپے میں بھی اُس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو نہ ہو وہ خواب دیکھنے سے نہیں چوکتی۔

محبوبہ اپنے عاشق کو کسی اور کے گھر کا چوکیدار نہیں بننے دیتی..... وہ نو بیاہتا بیوی سے لے کر بڈھی بیوہ تک اسی سبب کی بنا پر حسد کی آگ میں جلتی ہے۔ اگر خواب پورا بھی ہو جائے تو بھی خواب اُس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ شاید اگر..... تھیں.....؟ اُس کی جان نہیں چھوڑتے..... مرد کی جبلی منشائے ایزدی اور عورت کا یہ خواب ہر سطح' ہر ملک' ہر موسم میں مرد و زن کے ڈرامے میں مختلف قسم کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اسی رنگ کشی سے رنگ کائنات قائم و دائم ہے اور رونق حیات ہے۔ وفا کی طلب اور بے وفائی کی ضرورت سے مرد اور عورت کا باہمی اتصال اور موٹی کیول بنتا ہے۔

یہ شاید میرا اندازہ ہے کہ شادی کے بعد وہ پردہ پوش ہوئے' قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ بچپن سے ہی خاں صاحب اندر کی گپت غار میں سادھو صورت سمادھی لگا کر زندہ رہنے کے عادی تھے۔ اسی غار میں اُن کی جڑی بوٹیاں' من پسند کتابیں' جگہ جگہ سے تلاش کی ہوئی قلم دواتیں' بال پوائنٹ' ہائی لائٹر' مارکر' ڈائریاں' ان گنت قسم کے پیڈ' بادام' پستے'

اخروٹ، لیمن ڈراپ، چوکلیٹ، کیلکولیٹر، فون، گھڑیاں.....وہ اپنی غار میں علی بابا کی طرح رہتے تھے۔ پرانی یادوں
ڈراپ کی طرح چوسنا سیکھ لیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے کھل جا سم سم کہہ کر یہ سارا خزانہ ہتھیا لیا اور اُن کے
والوں میں جن کی وجہ سے یہ خزانہ جمع ہوا تھا اپنی پراپرٹی بنالیا۔

پھر جن کے اظہارِ محبت کے سلسلے میں یہ مال اکٹھا ہوا لوٹانے کی کوشش کی۔

عجیب سی بات ہے کہ میں کئی مہینے اُن کی یادوں کو مالِ مسروقہ سمجھ کر بانٹتی رہی اور غار خالی نہ ہوئی۔ اُن کی
میں مَیں نے کبھی اُن کے تخلیے میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ کبھی کوئی اُن کا خط نہ پڑھا۔ اُن کے تحریر شدہ خطوں کو چو
پڑھنے کی جسارت نہ کی۔ اب وہی خط پڑے ہیں۔ ان سے کارٹن بھرے ہیں اور پڑھنے کی نوبت نہیں آ رہی۔ وہ
جن کو کوئی ہاتھ لگاتا تو اُن کے اندر "سی" کی سی کیفیت پیدا ہوتی۔ الماریوں میں پڑھنے والے چھونے والے کی
ہیں لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس گونگے خان صاحب کو بہت جلد پہچان لیا تھا۔ اس کی سادگی، اس کی گیت گیھا کی ctity
سمجھ لیا تھا اسی لیے ہم دونوں بڑے آنند سے بڑی سہولت اور شانتی سے ساتھ ساتھ رہے.....لڑنے جھگڑنے
جانے کے جتنے مواقع تھے ہم دونوں نے ضائع کر دیے اور ہر قیمت پر امن کا سفید جھنڈا لہرائے رکھا۔ اس میں سا
حسنِ سلوک اور نرمی کا مظاہرہ خان صاحب کی شخصیت میں تھا۔ وہ کبھی مجھے ابھارنے، اکسانے، اشتعال دلانے کی
کرتے۔

مہاراجہ رام چندر کی طرح شانتی سروپ مہارانی سیتا کی جگہ سنگھاسن پر خالی رکھتے۔ اُن کی جگہ کوئی
تو وہ لوگوں کی عقیدت، محبت، پذیرائی کا الاؤ ایسے مزے مزے سے جلاتا اور میری نس نس میں ایسی دھونی دیتا کہ
بدن میں آگ لگ جاتی اور میں ہنگارنی چلاتی واویلا مچاتی گھر گھر ٹیلی فون در ٹیلی فون اپنے خدشات، جلاپے کی
لے کر پہنچتی۔

لیکن وہ تو ہر تحفۂ اظہارِ عقیدت کا کمبل، چھوٹے سے روشن دیئے کی طرح اپنی غار میں لے جاتے۔
چاہنے والے شہر سے، دُور دراز ملکوں سے جو بھی نادر زمانہ بھیجتے وہ اس سوغات کو اللہ کی رحمت سمجھ کر نظروں سے
پھر گپت غار میں اس پیا نام کے دیئے کو جلنے کے لیے رکھ دیتے۔

اُن کے پاس ان گنت پن، مارکر، بیٹریاں، کیلکولیٹر، ٹرانسسٹر، سینٹ نہ جانے کیا کیا ساز و سامان
تھا۔ لیکن یہ سامان وہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی غار میں خانہ کعبہ کے وہ پتھر سب سے اُونچے دھرے تھے
لائے تھے جب صحن کعبہ سنگ مرمر کا نہ بنا تھا اور جس پر عقیدت مند جہلا اپنے کفن آبِ زم زم سے دھو کر سوکھنے کے
بچھایا کرتے تھے۔

ان پتھروں کے آس پاس وہ خزانہ الماریوں میں، فرش پر، اندر الماریوں میں، درازوں میں پڑا تھا۔
اس خزانے کو نہ دلخراشی کے لیے کھولا نہ فخر ذات کو متکبر کرنے کا باعث بنانے کے لیے استعمال کیا.....یہ سارے
کی سادھی کا حصہ تھے۔ وہ مان رکھنے، مان بڑھانے، عزتِ نفس بحال کرنے کے لیے یہ تحفے قبول کرتے تھے.....

آنکھیں موندے زندگی کو صرف ضرورت بھر استعمال کرنے پر قادر ہو کر ہر خوشی ہر غم کو لبیک کہتے ہوئے زندگی کو لیمن کی طرح چوستے' اپنے مخصوص آسن میں بیٹھے رہتے۔

اُن کی عادت تھی جب کبھی وہ کسی کو قریب کرنا چاہتے اُسے اہمیت دے کر اپنے سے بڑا درجہ دینے کے موڈ میں ہوتے تو اُس سے فرمائش کرتے..... منجھلے بیٹے انیس خاں کا فون آتا..... "ابو! میں لندن جا رہا ہوں..... کچھ ٹیلی فون کے لیے دیکھنے.....کوئی چیز جو آپ کے لیے لاؤں۔"

اب خاں صاحب بڑے انہماک سے اُسے قلم، پن، سیاہی، مارکر اور جانے کیا کیا لکھواتے.....وہ بھی سعادت مند بچے کی طرح ساری تفصیل لکھتا.....اب دونوں میں ان ہی چیزوں کے سلسلے میں کئی فون آتے جاتے۔ پھر ثویلہ کو بھی تاکید ہوتی کہ "انیس خاں بھول جائے گا تم اسے یاد دلانا میں نے یہ چیزیں لکھوائی ہیں۔ کوئی چیز کم نہ ہو۔"

میں قریب بیٹھی ایک ماں کی طرح سوچتی کہ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ انیس بیٹے پر خواہ مخواہ اتنا بوجھ کیوں..... ہر طرح میں بھی صرف یہی سوچنے پر قادر تھی کہ بیٹے کو سوئی بھر تکلیف نہ ہو۔ میرا تخیل وہاں نہ پہنچ سکتا تھا جہاں پہنچ کر بوجھ اُٹھانے کی ٹریننگ دینا' بیٹے کو فرمائشوں سے نبٹنے اور اپنے کو بہان پر کاٹھی ڈلوانے کا علم بھی آنا چاہئے۔ اور یہ علم صرف باپ عطا کر سکتا ہے.....ماں کا بس چلے تو بیٹا ہمیشہ اُس کی گود میں بیٹھ کر دودھ پیے اور کبھی اپنے پاؤں پاؤں چلنا بھی سیکھے.....اپاہج ہو جائے پر اُس سے بندھا رہے۔

واپسی پر ادنیٰ فرصت میں انیس خاں اور ثویلہ تحفے لے کر وارد ہو جاتے۔ ابو اشفاق ان کے بہت قریب بیٹھے۔ اب ایک ایک پن نکال کر دیکھا جاتا۔ اُس کی قیمت کو عینک ٹھیک کر کے خاں صاحب پڑھتے۔ ثویلہ کہتی..... "ابو! پہلے ہم سلفریج گئے وہاں تو یہ برانڈ تھا ہی نہیں.....ایک افریقی لڑکا سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کچھ سامان لگائے بیٹھا تھا وہاں یہ موجود تھے۔ اس برانڈ کے پن انیس دیکھ ہی رہے تھے کہ دور سے پولیس مین آ گیا..... لڑکے کو دیکھتے ہی لڑکا سامان لے کر بھاگ گیا۔ یہ پن چھوڑ گیا.....اس پر کچھ خرچ نہیں آیا۔"

"نہیں نہیں.....ثویلہ! یہ وہ پن نہیں ہے۔ یہ تو ساؤتھ ہال والی دکان سے ملا تھا جب ہم اسما سے ملنے گئے تھے۔"

اب ثویلہ انیس ساؤتھ ہال کی باتیں سنانے لگتے اور خاں صاحب ایسی حیرت سے سنتے جیسے وہ کبھی ساؤتھ ہال گئے ہی نہیں یا وہاں اپنے عزیزوں سے ملنے ہی نہ گئے ہوں۔ اُنہیں معلوم ہی نہ ہو کہ لندن سے ساؤتھ ہال کیسے پہنچا کرتے تھے؟ وہاں ایشیائی لوگوں کا رہنا سہنا کیسا ہے۔ زندگی کس نہج پر گزرتی ہے۔ وہ اپنے بولنے کی پٹاری بند کر کے کانوں کے مائیکروفون کھول دیتے.....خاں صاحب بڑی عاجزی سے گفتگو کرتے تھے لیکن اس ساری حیرت انگیز خوبی کی بنیادی وجہ اُن کے سننے کا عمل تھا۔ وہ انتہائی توجہ کے ساتھ سنتے۔ ون ٹو ون گفتگو میں وہ مجسم کان بن جاتے۔ اپنی بولی بند کر کے' بغیر گلے لگائے ہاتھ ملائے بات کرنے والے کی تخت نشینی میں حاضر باش قسم کا رویہ اپنا کر مودب رہتے۔ سننے کے مقام پر وہ مجسم حیرت ہوتے اور یہی حیرت اپنی گفتگو میں منتقل کر دیا کرتے۔

انیس خاں کے سامنے یوں ان بھول بیٹھے رہنے سے ایسا رابطہ بنتا جو کسی اور طور ممکن نہ ہو سکتا۔ اُس کے جانے کے بعد سارے تحفے کئی بار آنکھوں سے عقیدت رنگ دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک دو چیزیں ہی استعمال کے لیے

رکھتے۔ باقی سب کسی الماری، دراز ڈبے میں بند کر کے گپت غار کا حصہ بنا دی جاتیں۔ محبت سے یوں قریب آئے باپ بیٹے کی یہ یاد بھی لیمن ڈراپ بن جاتی جسے سادھی کے وقت وہ شانتی سے چوستے۔

ریاض محمود کو فون کرتے..... "مریں! ہنگلی ہانڈی نہیں پکتی تجھ سے..... خرچے سے نہ ڈر اللہ اور دے گا کسی روز ہنگلی ہانڈی پکا کر لے آئیں۔"

ہفتے کے روز ریاض محمود جسے ہم سب شاہی باورچی کہا کرتے ہیں، ہنگلی ہانڈی سمیت حاضر ہو جاتے۔ گھر میں اس کی خوشبو پھیل جاتی۔ مجھے وہم ہوتا کہ ریاض محمود کو زحمت ہوئی ہوگی..... خاں صاحب کا خیال تھا کہ ہانڈی کے باعث سارے 121۔سی میں درک پا گیا ہے۔

ریاض میاں کی ہانڈی بھی کشمیری کھانوں کی طرح بڑی انوکھی ایجاد تھی۔ گو واش کھٹے چنگن شب کشمیری کھانے نصیر انور، کشور نصیر اور راف جان نے ہمیں کھلائے تھے لیکن ہنگلی ہانڈی کی ایجاد ایک ایسے باورچی کی تھی جو کھانا پکانا نہ جانتا تھا۔ اُسے جو کچھ بھی باورچی خانے میں مہیا ہوا، بازار سے دستیاب ہوا، اسے گوشت میں مسالے کی جو کچھ ملتا گیا، ریاض میاں ڈالتے گئے۔

بانو باجی دم بخود کچھ منع کرنے کے انداز میں کچھ حوصلہ افزائی کے دستور پر چل کر ڈلواتی رہیں۔ گوشت کا سالن تیار ہو گیا جس کی ترتیب سوائے ریاض میاں کے کسی دوسرے کو معلوم نہ تھی۔ اسی صدری نسخے لگائے شاہی باورچی کا خطاب خاں صاحب سے لے کر اور اسے خلعت کے طور سینے پر سجا کر ریاض آتے رہے۔ یہی فرمائش یہی رسان سے بات سننے کا عمل رسی کا وہ مضبوط پل بن گیا جس کے نیچے سے زندگی کھلبلاتا پانی ٹکریں مارتا گزر رہا ہے لیکن دونوں ساتھ آتے رہے جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم ہوم اکنامکس کالج گئے..... یہاں لڑکیوں کو گھر داری کا علم سکھایا جاتا ہے۔ سے لے کر کھانے مینو اور چھوٹی انکم میں بڑے ورشن ویجے کا فن بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں پر امید چلتے خود اعتماد کام کاج میں مستعدی سیکھ کر گھر داری کو بڑے منظم سائنسی طریق پر کر سکتی ہیں۔ تمام لڑکیوں کو بانٹ کر انہیں الگ الگ Homes الاٹ کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھار سارے گروپ مل کر کسی قابل ذکر کر کے اس پر اپنے علم و فن کا رعب گانٹھتی ہیں۔

ایسی ہی ایک تقریب میں خاں صاحب گئے۔ میں بھی ساتھ شامل باجہ تھی۔ تمام چیزیں بڑی نفاست خودنمائی کے انداز میں پیش کی گئی تھیں۔ ہم دونوں نے بحری قزاقوں کی طرح خوب رج کھایا اور درباری جی حضوری والوں کی طرح خوب دل کھول کر داد پیش کی۔ واپسی کے وقت طالب علم ایک دوسرے کے بازو کمر ہاتھ جوڑے ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اس چاند ہالے سے خاں صاحب نے کہا..... "کچھ سامانِ خورد و نوش بچا ہے کہ نہیں؟"

"جی بہت کچھ بچ گیا ہے۔"

"تو مرو ساتھ کچھ نہیں دینا..... میرا اسٹاف کیا کہے گا کن تھوڑدلیوں کے مہمان بن کر گئے تھے۔"

وہ ساری چوکڑیاں بھرتی رخصت ہو گئیں۔ اس وقت خاں صاحب نے جیب سے کارڈ نکالا

ن دو گولیوں سمیت منہ میں ڈالیں اور انہیں چوسنے لگے۔ وہ جب بھی دل رکھنے، خوش کرنے کے لیے بسیار نوشی اور اُن کا معدہ جواب دے جاتا تو وہ اسی طرح بعدازاں ہاضمے کے لیے کئی ٹوٹکے استعمال کرتے۔ دوائیوں کے چورن، آیورویدک پڑیوں، ایلو پیتھک گولیوں، Effervescent الکاسلزر، اینوز سے لدی پھندی تھیں جن کو پوری نظر بھر کر کبھی نہ دیکھا..... وہ علاج معالجہ بہت شرماہٹ کے ساتھ کرتے تھے گویا سمجھتے ہوں کہ یہ عمل توکل سے

ہرنیاں چوکڑی بھرتی ہوئی قہقہے لگاتی، تتلیاں بجاتی غائب ہوگئیں..... خاں صاحب راضی کرکے راضی ہوئے پینے کا سامان جوزادِ راہ بنا کر لائے تھے، اُردو سائنس بورڈ میں اپنے سٹاف کے لیے اُتار کر گھر آگئے۔

شاید 2002ء کا واقعہ ہے۔

مجھے A.R.Y. نے دس ہزار ڈالر انعام دیا تھا۔ یہ انعام لائف ٹائم کارکردگی کی وجہ سے ملا۔ اس میں میری کم اللہ کا فضل اور بھائی جمیل الدین عالی کی کوشش بمقدار وافر اور جج صاحبان کا حسن ظن زیادہ شامل تھا۔

میں نے ہولے ہولے چاروں کھونٹ مشاہدہ کر کے ڈھیرے ڈھیرے چھان پھٹک کے بعد ایک بات جانی ہے باقی شاید انسان مانی نے لیکن ایک بات پر اُس کا دل کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اُس کی کمائی ہوئی دولت اور چکاچوند کردینے والی کے فضل، اُس کی دین، اُس کی مہربانی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ زبانی کلامی بنے واثقی، کیا شک ہے کہے لیکن اندر ہی تصور سے منمناتا رہتا ہے کہ سارا کچھ اس کی اپنی محنت کا ثمر ہے..... یہ پٹی اُسے نفس رٹاتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں بھی بظاہر منمنی سی حلیم الطبع، انکساری کی پوٹ بنی لیکن اندر اپنی کتابوں اور ڈراموں کی گنتی کرتی اپنی محنت پر راچی پہنچی تھی۔ انسان میں یہ بھی وصف ہے کہ وہ قرآن کو بھی اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ رزق نے کی جو اہمیت ہے اُسے جاگ لگا کر خوب خمیر اُٹھا کر اپنے نفس کو یہ باور کرا لیتا ہے کہ یہ جو گل و گلزار کھلا ہے اُس پنچے، گودنے، کیاری کیاری خون پسینہ ایک کرنے سے وجود میں آیا ہے۔

خاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری چادر اور چاردیواری بنے ساتھ تھے..... وہ خطرے کے مقام پر آگے ہوتے م کے وقت آخری سیٹوں پر جا بیٹھتے۔

اسی قیام کے دوران ایک روز چلتے پھرتے عظمیٰ سے ملاقات ہوگئی۔

اس فنکشن پر جاتے وقت تو عظمیٰ گیلانی اور رمیض راجہ مجھے فلائٹ پر نہ ملے لیکن واپسی کے وقت ایئرپورٹ پر سے ملاقات ہوگئی۔ رسمی مبارکباد کے بعد رمیض راجہ بولا..... ''آپا جی! میں آپ کے گھر کرکٹ کھیلنے آیا کرتا تھا..... میں ن کا دوست ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر اثیر کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ ایک بار جب نے فل ٹاس ہٹ کیا تو گیند آپ کے برآمدے میں لگی کھڑکیوں سے جا ٹکرایا..... وہ شیشہ میں نے توڑا تھا آپا جی..... گو الزام اثیر خاں نے اپنے ذمے لیا۔''

''وہ ایسا ہی ہے رمیض میاں..... اچھا ہی ہوا تم نے مجھے بتایا نہیں ورنہ لمبا چوڑا لیکچر تمہیں بھی مل جاتا۔''

چند ثانیے وہ چپ رہا پھر بولا..... ''آپا جی! آپ نے اشیر کو فرسٹ کلاس کرکٹ میں کیوں نہ جانے دیا۔ کم تو آ گیا تھا۔ اگر وہ کرکٹر بن جاتا تو بڑا نام کماتا۔''

''بھائی! تمہیں علم نہیں خوف میرا بنیادی وصف ہے..... خوفزدہ لوگ بچوں کو کسی عمل یا سوچ کی آزادی نہیں دے سکتے..... خوف کو آپ محبت تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اپنی طرز کی Concern ہے..... میں اُسے کیونکر جانے دیتی..... میں اُسے کیسے کھلے میدان تحت Pitch کے حوالے کر دیتی۔ میں تو کرکٹ کی لال گیند کو بھی ماتھے میں لگنے والی تھی..... پھر میں اُسے اتنے بڑے امتحان میں کیسے جھونک دیتی؟ میرا خیال تھا کہ اس فیلڈ کے لوگ عورتوں سے بچتے اور اس کھلی ڈلی زندگی میں پناہ پانا ان کے لیے گناہ نہیں رہتا..... پھر تو ہی بتا جہاں اتنے خطرے ہوں اس جگہ کیسے جھونک دیتی۔ میری تو بیٹی کہاں۔''

خان صاحب نے کبھی اپنے بچوں کے کیریئر میں زیادہ میں میخ نہیں نکالی۔ شاید اُن کا یقین تھا کہ عزت شہرت سب اللہ کی دین ہے۔ ہو سکتا ہے اُن کے پاس ایسی باتوں کی نہ اہمیت ہو نہ وقت..... اُن کے برعکس آج پہلے اپنے بیٹے کو اپنی سیٹ کے لیے تیار کرتا ہے اور پھر ریٹائر ہوتا ہے..... آرٹسٹ ترنت ہی اپنی اولاد کو بام عروج پر پہنچا کر پسپا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بھی باپ دادا کا پروفیشن نسلوں چلتا تھا لیکن تب Awareness نہ تھی اور اولاد کو سنہرے مستقبل دیکھنے کی عادت بھی والدین میں نہ در آئی تھی۔

لوہار کا بیٹا لوہار سنار کا بیٹا سنار بڑھئی کی اولاد بڑھئی قرب کی وجہ سے غیر محسوس طریقے سے سارا علم لے لیتی جیسے کشمش پانی میں پڑے رہنے سے میٹھی تو نہیں رہتی لیکن بہت سا پانی چوس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ایک دن اسی فنکشن کے دوران عظمیٰ گیلانی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اور خان صاحب ''پادائے دوراں'' ''تزدبان عرفاں'' کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ پھر اچانک عظمیٰ نے کہا ''خان صاحب! میں چھوٹی بہو نے ایک فرمائش کر رکھی ہے اُسے پورا کرنا ہے۔''

''اچھا؟ تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ فرمائشیں پوری کر سکو۔ سنا ہے تم ایک بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی چلا رہی ہو کسی میاں کے ساتھ۔''

کچھ دیر عظمیٰ گیلانی بتاتی رہی کہ کیسے رضا میر کے بیٹے اُس کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی چلا رہے تھے اور کیسے اب اُس کا زوال بھی شروع ہو چکا تھا۔

''آپ کو معلوم نہیں اشیر بھی تو میرے ساتھ ہوتے تھے Midas میں۔ سنا ہے اب وہ اسلامک انویسٹمنٹ میں چلے گئے ہیں۔''

''میں کچھ پوچھتا ہوں تو کچھ اور بتاتی ہے۔ جو ایکٹر اپنی لائنز یاد کر کے نہیں آتے اُنہیں عموماً فضول قصے بیان کرنا پڑتی ہیں۔''

اپنی خوبصورت آواز میں عظمیٰ نے سوال کیا۔

''تو جی آپ کیا پوچھ رہے تھے خاں صاحب؟''

''عقل کی کوکون! میں پوچھتا ہوں کیا تو فرمائشیں پوری کرتی ہے لوگوں کی؟''

''لوگوں کی تو نہیں..... لیکن بہو کی فرمائش تو ضرور پوری کروں گی..... اُس نے مجھ سے نمکو مانگی ہے۔ یہاں کی مشہور ہے خاں صاحب۔''

''اُس سے ڈرتی ہے ناں؟''

''ہاں جی کچھ کچھ۔''

''عجیب سی بات ہے آج کل ساس بہو سے ڈرتی ہے..... پہلے بہو کی جان جایا کرتی تھی ساس سے لیکن اگر تو زمانے میں ہوتی تو بھی تو ہی خوفزدہ ہوا کرتی۔'' خاں صاحب بولے۔

''وہ کیوں جی؟''

''بھائی میرے ایک اچھے فنکار میں اگر خوف نہ ہو تو وہ اچھی طرح پرفورم نہیں کر سکتا..... کرٹن کال سے پہلے عام ایکٹروں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جایا کرتے ہیں۔ کیمرہ رولنگ کی آواز سن کر خوف سے ایکٹرس ہو جاتے ہیں۔''

''سچی خاں صاحب! ''زبان عرفاں'' میں جب فاروق ضمیر مجھے کندھے پر لاد کر ساہوکار کے دروازے پر لایا یا میں نے سوچا تھا کہ بھاگ جاؤں اور پھر کبھی ٹیلی ویژن سٹیشن میں قدم نہ دھروں۔''

''اچھا یہ بتا مجھ سے کبھی ڈر لگا تجھے؟''

''ریہرسل کے وقت جان جایا کرتی تھی لیکن جب taking ہوتی اور آپ آجاتے تو پھر حوصلہ بڑھ جاتا۔ لگتا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گرو جی کچھ بگڑنے نہیں دیں گے۔''

''اچھا تو جب بہو کے لیے نمکو خریدنے جائے میرے لیے بھی چڑوے والا نمکو لانا..... بھول نہ جائیں مریں۔''

''میں بھول سکتی ہوں جی۔''

انتظار حسین، عظمیٰ گیلانی اور ہم دونوں فائیو سٹار کی چوتھی منزل میں تھے۔ عموماً نیچے اُترنے سے پہلے ایک دوسرے کو فون کر لیتے۔ کھانے پر اُترتے وقت لفٹ میں ملاقات ہو جاتی۔ ایک کا مہمان آتا تو دوسرے کو علم ہو جاتا کیونکہ ٹیلی ویژن کے حوالے سے قریباً سارے مہمان سانجھے تھے۔

اسی طرح عظمیٰ سے لفٹ میں ملاقات ہو گئی۔ وہ بازار سے نمکو کے تھیلے اُٹھائے اُوپر جا رہی تھی۔ ہم کھانے کے لیے نیچے جانے کے لیے سوار ہوئے تھے۔

''اُتریے اُتریے خاں صاحب! یا اپنے نمکو کمرے میں رکھ لیجیے۔'' چار نمبروں والی منزل پر ہم تینوں اُترے اور اُس نے کچھ تھیلے مجھے پکڑا دیے۔

''یہ تو بہت زیادہ ہیں عظمیٰ اتنے سارے تھیلے۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔

''زیادہ کہاں ہیں کم ہیں..... ہاں بھئی بوری بازار سے بس اتنے ہی ملے؟'' خاں صاحب بولے۔

''عظمیٰ میرا بیگ اتنا بڑا نہیں کہ یہ سب اُس میں سما سکے۔'' میں بولی۔

''چلیے میں لاہور پہنچ کر گھر پہنچا دوں گی۔''

خاں صاحب نے بڑے ندیدے انداز میں تھیلے پکڑے..... ''ناں جی قدسیہ! اس کا کیا اعتبار۔ یہ تو چلتے کو پکڑا دے گی..... یہ ایسی ہی ہے نعمتیں بانٹنے والی''

خاں صاحب نے لاہور پہنچ کر یہ تحفہ ایک آدھ بار کھایا اور پھر اسے مہمانوں کی نذر کر دیا۔ رکھنے کو وہ یہ ضرور اسے بھی اپنی گپت گیھا کا حصہ بنا لیتے اور پھر بھول بھال جاتے۔

شمیم فاطمہ خاں صاحب کے ساتھ تلقین شاہ میں کام کیا کرتی تھیں۔ ''ادھ کھایا امرود'' لکھنے والے خاں کی بیگم اور انگریزی کے پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی والدہ تھیں۔ بڑی پاٹ دار آواز بے لاگ لہجہ بلا کا ڈھنگ..... جب بے دھڑک ''تلقینیہ'' کہہ کر خاں صاحب سے مخاطب ہوتیں تو پروگرام کرارا ہو جاتا۔ پتہ نہیں کہ جس قدر شہرت فضل الرحمٰن صاحب کو ملنا چاہیے تھی نہ ملی۔ ''ادھ کھایا امرود'' کا لکھنے والا گمنامی میں ہی مر گیا۔ فاطمہ کی آواز سارے پاکستان میں گونج اٹھی..... یہ اللہ کے بھید ہیں جن میں کسی کو دخل نہیں۔

شمیم فاطمہ پریم کی ڈوئی چلا کر خوب سارے میوے ڈال کر شیر خرما پکا کر لاتیں۔

اور خاں صاحب کہتے ''شمیم! ہمارے ایک ڈاکٹر اشرف قاضلی صاحب ہیں۔ ان کی ''تفسیرِ ...'' تمہاری نظر سے گزری ہو۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ سویاں اور حلوہ بغیر میوے کے پکانے چاہئیں۔ یہ چیزیں کھانے ... بن جاتی ہیں.....'' لیکن خاں صاحب کی بات سن کر بھی شمیم رکاوٹیں ڈالنے سے باز نہ آتیں اور خاں صاحب ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے شیر خرما کو پسند کیا۔

فون کی گھنٹی بجتی ''میں شہزاد احمد بول رہا ہوں..... ذرا خاں صاحب سے فون ملا دیجیے'' اب ... ہو جاتا۔ دونوں آواگون سے لے کر وجودیت تک انسانی سوچ کی تجلک ڈوریوں کو سلجھاتے۔ شہزاد احمد کا ... ہے۔ وہ غیر نصابی فلسفے کی کئی کتابیں تخلیق کر چکے ہیں۔ خاں صاحب زندگی کو صوفی رنگ کی عینک پہن کر ... تنے دیکھنے کے عادی تھے۔ جہاں ایک سفید کرن پوری قوسِ قزح بن جاتی ہے۔ نور کی وحدت کیسے کثرت ... ہے۔ جلوہ ایک ہی ہے کبھی خوشبو بن کر پھیلتا ہے کبھی رنگ بن کر نکھرتا ہے کبھی کرنوں کی طرح ہر روپ کو ... ہے۔ لیکن ساری گفتگو کے بعد پریم کہانی اُدھوری رہتی۔

خاں صاحب کہتے ''شہزاد یار! وہ تیرا تھوم کا اچار بس دو تین دن کا رہ گیا ہے۔ اس سے میرے ... رہتا ہے..... پتہ نہیں بھائی میرے تو کیوں بھول جاتا ہے کہ میں انجائنا کا مریض ہوں۔''

میں نہ مصلحت سمجھتی تھی نہ دانائی۔ غلط وقت پر بیجا سچ بولنے میں راسخ..... جب فون بند ہو جاتا تو کہتی ''خاں جی! ابھی تو پوری بوتل اچار کی پڑی ہے۔''

وہ نہ مجھے سرزنش کرتے نہ میری دانائی یا سچ کو چیلنج کرتے۔ بس مسکرا کر کہتے ''آنے دو..... آتے ہیں ان کو آتے رہنا چاہیے..... اس جذبے سے رزق پاک ہوتا ہے۔''

میں اُن کی منطق کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن چپ ہو جاتی.... ایک بار اُنہوں نے میری موجودگی میں عطاء الحق قاسمی
بار! ایک روز..... مجھے اچھی طرح سے تو نام یاد نہیں شاید دارا شکوہ تھا..... یا شاید کوئی اور شہزادہ..... یہ شہزادہ
ے کی اشرفیوں سے ٹھنسے ہوئے لے کر میاں میر صاحبؒ کے آستانے پر پہنچا اور دست بستہ عرض کی حضور! اس
چوکھٹ پر ان گنت سوالی آیا کرتے ہیں۔ میری عرض ہے کہ یہ آپ خلق خدا میں تقسیم کر دیں..... اُن کا سوال بھی
رزق بھی پاک ہو جائے۔

میاں میر صاحبؒ ذرا سا لرزے۔ پھر دونوں ہاتھ بہ انداز انکار اُٹھا کر بولے ناں بابا ناں۔ میں چھوٹا سا جوہڑ
ت کا متحمل نہیں ہو سکتا..... یہ مالی اسباب تم داتا گنج بخشؒ کے ہاں لے جاؤ وہ سمندر ہیں..... علی ہجویریؒ
در کی طرح سب کچھ سمیٹ کر بھی اُجلے کا اُجلا رہتا ہے..... ہمیں ایسی نجاست سے معاف ہی رکھو۔"

"سنا ہے..... جونہی وہ شہزادہ والا تبار علی عثمان ہجویریؒ کی درگاہ پر پہنچا..... ایک ساعت بھی نہ گزری تھی کہ
ے لدے توڑے چوسے ہوئے آموں کی طرح خالی ہو گئے..... داتاؒ نے انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا نہ کوئی بات کی نہ
می ترنت ہی تھیلیاں بانٹنے کا حکم دیا اور سب بھول گئے۔ اشرفیاں..... شہزادہ اور تھیلیاں..... ایک حکم کے ساتھ وہ
رغ ہو گئے۔"

بھی کچھ خاں صاحب بھی کیا کرتے تھے..... اُن کے پاس فتوحات آتیں..... کھانے پینے کی اشیاء ترنت بانٹ
..... رکھنے والی چیزوں کو گپت غار کا حصہ بنا دیا جاتا اور باقی سب کو فوراً ہی بھلا دیا جاتا۔

افضال حیدر اُن کے ساتھ اُردو بورڈ میں کام کرتے تھے..... اُن کے گھر سے ساگ اور مکی کی روٹیاں، رساول کی
ی۔ ان دونوں چیزوں کا گھر والوں کو بہت انتظار رہتا۔ جب کبھی اقبال شہاب یا افضال حیدر کے گھر سے ساگ
ں صاحب چسکے لے کر کھاتے اور کہتے..... "قدسیہ! کیا ایسا ساگ ہم نہیں پکا سکتے۔"

"مکی کی روٹی تو چکلے بیلن پر میں پکا سکتی ہوں لیکن یہ..... ایسا ساگ مجھ سے نہیں پکتا۔"

میں خاں صاحب کی توجہ ساگ سے ہٹا کر اپنی مکی کی روٹیوں کی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ مجھے ارمان ہوتا
ں چپاتی کی طرح پتلی مکی کی روٹی صرف قدسیہ ہی پکا سکتی ہے..... مجھے کھانا پکانے کا علم بھی خاں صاحب نے ہی
جب میری شادی ہوئی تو مجھے ہاف بائل انڈا بھی بنانا نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے کڑوے کریلے، کچے آلو، ڈالڈا میں
ی ہوئی روٹیاں، ٹھنڈی چائے پی پی کر اُنہوں نے مجھے رام کر لیا۔ وہ کھانے میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ صرف
ے اجتناب کرتے اور میری انا کو اسی تعریف کی تلاش تھی۔

جب کبھی فتوحات میں کوئی اچھا مزیدار کھانا آتا، وہ پکانے والے سے محبت کا اظہار اس طرح کرتے کہ ساری
پوچھتے اور کچھ ایسے وضاحت سے سوال اُٹھاتے کہ میری تربیت ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے ایک بار شاہد کے گھر سے
ن کر آیا۔ انکل ظفر کے یہ بھانجے غیبی طور پر ہماری توجہ میں رہتے تھے۔

انکل سے روسٹ کی ترکیب پوچھی تو وہ صرف کھانے تک شمولیت کرتے تھے۔ ترکیبوں سے اُنہیں کوئی سروکار
لے "قدسیہ آپا! آپ شاہد کی والدہ سے مل کر ترکیب پوچھ لیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے..... تم کسی دن اُس کے پاس جا کر طریقہ وزن پوچھ آؤ..... یہ آسان ہے۔"

میں شاہد کی امی کے پاس گئی..... ساری ترکیب کان اور کاپی کھول کر لکھی..... کئی مرتبہ روسٹ پکایا..... بنا لیکن وہ لذت پیدا نہ ہو سکی جو شاہد کی والدہ کے ہاتھ سے روسٹ میں منتقل ہوتی تھی..... پتہ نہیں کیا بات ہے شخص اپنا پریم رنگ' اپنی سائیکی' اپنا روحانی زور کیسے منتقل کر دیتا ہے..... عمارت ہو یا فنونِ لطیفہ' کھانا پکانا تربیت..... عمل کی حد تک پروسیس ایک ہوتا ہے لیکن نتیجہ کبھی ایک سا نہیں نکلتا..... تاش کے باون پتے انسانی چھبیس چیز اتنی رنگا رنگی پیدا کرتے ہیں کہ ارتقاء ختم ہونے میں نہیں آتا... کائنات ختم نہیں ہو سکتی۔

یہ سوال سائنس دان پوچھتا چلا جاتا ہے۔ نئے نئے جوابات بھی تشکیل کیے جاتا ہے لیکن صوفی ہاتھ اُٹھا "علموں بس کریں او یار....." علم رضا و رغبت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے..... عمل راستہ چلنا سکھا دیتا ہے لیکن راستہ پر منتج ہو اس کا تعین نہیں کر سکتا..... بس نیت کی درستی سے رضا و رغبت کے ساتھ چلتے رہنے میں ہی راحت اور عافیت ہے

مجھے یاد ہے

ایک روز سمن آباد میں خاں صاحب اور میں پچھلے ویہڑے میں بیٹھے تھے کہ اماں جی آ گئیں۔ ان کے الطاف ماموں بھی تشریف لائے۔ اماں جی ہمیشہ کی طرح شرمندہ شرمندہ ہنستی ہوئی بغیر استری کے ریشمی شلوار تھیں۔ اب اماں جی ڈرتے ڈرتے اپنے بیٹے کے گھر بھی آنے لگی تھیں۔ باتوں باتوں میں خاں صاحب نے

"اماں جی کریلے کیسے پکتے ہیں؟"

اماں جی ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگیں..... "بس دو تین نمکین پانیوں سے دھو لیا۔ پھر تھوڑا سا بھون کر ساتھ ہی پیاز چھوڑ دیا۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"پانی چھوڑ دیا کریلوں میں؟"

ماما جی الطاف بولے "ناں بی بی ناں..... اشفاق بیٹا..... کریلوں کو بھونتے جاؤ..... ڈھکنا دو..... ڈھکنا دو..... پھر بھونو..... پانی وانی نہ ڈالنا۔ قدسیہ بیٹی! کریلے کڑوے ہو جائیں گے۔"

ماں بیٹے نے اپنی ترکیب پر نہ اصرار کیا نہ ترکیب دوہرائی..... بس چپکے سے میرے گوش گزار کر طرح سہرا کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے کریلے دھو دھو کر چٹے سفید کیے..... ڈرتے ڈرتے پانی ڈالا..... کھانے ترکیب سے پکے کریلوں کی ہمیشہ تعریف کی لیکن وہ ذائقہ پیدا نہ ہو سکا جو اماں سردار بیگم کے کھانوں کی خاصیت کے قلب سے ڈوئی تک اور ڈوئی سے ہانڈی تک جو چیز منتقل ہوتی تھی' اُس کا عرفان مجھے نہ ہو سکا۔

ہم نئے نئے امیر ہوئے تھے۔ نودولتیوں کی طرح ہمیں بھی نئی چیزوں کا شوق ہونے لگا تھا۔ میز پر مہمان ورطۂ حیرت میں چلا جاتا ہے اور اخبار سے لے کر ہر انسان تک تھوڑا یا زیادہ دوسرے لوگوں کو حیران کرتے ہے۔ چائنیز کھانے نئے نئے رائج ہوئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ میں بھی چکن کارن سوپ' ہاٹ اینڈ ساور وغیرہ پکاؤں لیکن دو چار مرتبہ کوشش بیکار گئی۔ دسترخوان کے طفیل لوگوں کو مرغوب کرنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔

غالباً وہی عورتیں بالآخر اچھی باورچنیں بن جاتی ہیں، جنہیں دسترخوانی تعریف من بھاتی ہے۔ مروت لحاظ اور ... کے تحت لوگ پسندیدگی کا اظہار بھی کرنے لگے تھے لیکن اندر مجھے یقین تھا کہ ابھی ناپختہ ہے۔ پھر ایک کورس کا ... میں چھپا۔ یہ کورس چینی پکوانوں کی سکھلائی کا تھا اور غالباً اس کی سپانسر حیات احمد صاحب کی بیٹی غزالہ تھیں۔

وہی حیات احمد خاں جو کلاسیکی موسیقی کی بقائے دوام کرتے کرتے اس دنیا میں کل پاکستان موسیقی کانفرنسوں کو ... گئے۔ اس گھرانے کو احمد بشیر صاحب کے خانوادے کی طرح فنون لطیفہ سے گہری وابستگی تھی۔ غزالہ تخلیقی ایچ کے ... ے اہتمام سے خلق خدا کے لیے کورس وغیرہ ترتیب دیتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے سکھانے کا بھی ایک شارٹ کورس ... کرایا تھا جسے میرے بیٹے انیق اور انیس بڑے ذوق وشوق سے اٹینڈ کرتے رہے تھے۔

چینی کھانوں تک میں ایسے سہولت سے پہنچ جاؤں گی اس کی سب سے زیادہ خوشی خاں صاحب نے منائی۔

... ے کونگ کا چینی شیف ہمیں ماہر کرنے پر مامور ہوا..... سبزیاں کاٹنے کا فن ہم نے سیکھا ضرور لیکن جس طرح ... تے اور چھری چلاتے یہ ممکن نہ تھا۔ ترکیبیں تو قریباً سب سمجھ میں آ گئیں لیکن سبزیاں کاٹنا عموماً خاں صاحب کا ... نمنٹ ہوتا۔ شیف صاحب کو نقل کرنا آسان تھا لیکن وہ پریکٹسیں ہاتھ آئیں نہ کبھی ویسے رزلٹ نکلے۔ البتہ تعریف ... ے ایک اور دروازہ کھل گیا۔

مجھے یاد ہے ایک روز شہاب بھائی اور خاں صاحب کہیں باہر گئے تھے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ انہیں ''کونج'' میں ... دعوت دی تھی۔ چکن کارن سوپ، ہاٹ اینڈ ساور، فرائیڈ چکن، رائس اور پران اینڈ ویجی ٹیبل مینو میں تھا۔

شہاب صاحب نے گھستے ہی کہا..... ''ہمارا چینی کھانا بہتر ہوا کرتا ہے..... ہے ناں اشفاق؟''

خاں صاحب چپ رہے۔

مجھے خوب علم تھا کہ شہاب صاحب دل رکھنے کی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی اُن کی تعریف سن کر ... باغ ہو گیا۔ انسان بھی کیا گھٹیا Specie ہے۔ اس کا ہیرا سن تو تا نہ کوئی وصف ہے نہ ذات..... بس اپنی تعریف سن ... خود آزادی چھوڑ کر ہتھکڑی پہننے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ جاگیردار اور میراثی اسی تعریف کی زنجیر سے بندھے رہتے ... جاگیردار اپنے غلے کا منہ کھلا رکھتا ہے اور خوشامدی میراثی کو واہ جی واہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

نہ تو مزارعے، میراثی کی ضرورت کبھی پورے طور پر پوری ہوتی ہے نہ نمبردار، جاگیردار فیوڈل لارڈ ہی کا تعریف ... بھرتا ہے۔ دونوں ٹنڈیں بھر بھر کر لاتے رہتے ہیں۔ رہٹ چلتی رہتی ہے۔ طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ سسٹم ... ٹوٹنے نہیں پایا۔ شہروں میں، دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں میں یہ سسٹم چھوٹے بڑے ردوبدل کے ساتھ جاری ہے۔

سفر در سفر

سفر لندن

تشخیص کے بعد مجھے بلڈ کینسر کا مرض بتایا گیا اور میں مستقل طور پر ہسپتال میں رہنے لگی۔ دو تین بوتلیں دن کے ... تیں لیکن صبح بلڈ کاؤنٹ کم نکلتا۔

ان ہی دنوں جب میں ایم آئی آر اور بلڈ میٹ کے چکروں میں تھی' ایک روز جمیلہ ہاشمی چند ادیبوں کے
ہمارے گھر آ گئیں۔ خاں صاحب کی پیشی ڈرائنگ روم میں ہوئی۔

"سنو اشفاق (نہ بھائی نہ شائی) تم قدسیہ کو لندن کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں اس کا علاج ہو جائے گا۔
سائنس نے کینسر کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ Para-medical staff بھی بہتر ہے اور ڈاکٹر بھی۔"

"بھائی میری پسلی نہیں ہے۔"

"اگر تمہاری پسلی نہیں ہے تو ہم سب ادیب مل کر خرچ برداشت کر لیں گے۔"

"ضرور ضرور میں جلد جواب دوں گا۔ اس کے دو تین ٹسٹ اور ہو لینے دو۔"

خاں صاحب گو بظاہر جھوٹے ہی نظر آتے ہوں' و لڑنے بھڑنے' مناظرہ کرنے اور دل آزاری سے بچتے تھے۔

اب وہ اسی سوچ میں مبتلا تھے کہ کیسے اس گھر آئی بلا سے جان چھڑائیں؟

پھر پتہ نہیں کیسے B.C.C.I. کے بینک کو خبر ہوئی۔ ان دنوں برنی صاحب اس بینک کے صدر تھے
صاحب وائس پریذیڈنٹ..... نہ بابا جاوید طارق (جیدی) نے میری مخدوش حالت دیکھ کر مشتاق احمد یوسفی صاحب
دی۔ ان دنوں جیدی M.C.B. بینک میں آفیسر تھا۔ اس نے یوسفی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پتہ نہیں کیا
لیکن یوسفی صاحب کا خاں صاحب کو فون آ گیا کہ آپ قدسیہ کو لے کر آئیں تو ہم سارے سفر کا خرچ برداشت کریں گے۔
چوری چوری اعانت کرنے والے یوسفی صاحب ایک لحظہ کے لیے محسن کی شکل میں سامنے نہ آئے اور انہوں نے
برنی صاحب کے سر تھوپ دیا۔

ہم ڈرتے ڈرتے پہنچے۔ جب ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترے تو ابھی سامان نہ آیا تھا۔ خاں صاحب
والی بیلٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا گئے۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک قد آور مضبوط سردار
ہوئے تھے۔ شاید انہوں نے میری شکل سے اندازہ لگایا۔ وہ اٹھے اور سامان باہر لے جانے والی ریڑھی اٹھا
اور بیلٹ کے پاس کھڑے خاں صاحب سے کہا "بھرا جی! آپ فکر نہ کریں۔ مجھے صرف اپنا بکس اشارے
میں اتار دوں گا۔ آپ بی بی کے پاس رہیں۔"

خاں صاحب چپ رہے۔

اس سے پہلے ہمارا سوٹ کیس دو بار بیلٹ پر چکر لگا چکا تھا۔ اب سردار جی نے ترنت ہی سوٹ کیس
ریڑھی میں رکھ دیا۔ خاں صاحب نے ہوائی جہاز کے اندر جانے والا بیگ اور ایک آدھ اور بیگ اوپر رکھے اور
کا شکریہ ادا کر کے چلتے بنے۔ حسنِ اتفاق سے سکیورٹی پر جو آفیسر تھا اس نے سوال کیا "آپ اشفاق صاحب ہیں"

"جی۔"

""ایک محبت سو افسانے" والے۔"

"جی۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی..... چلئے کوئی چیکنگ نہیں۔"

اب فکر یہ تھی کہ ہمیں کون لینے آئے گا اور ہم کہاں ٹھہریں گے؟

جونہی باہر پہنچے' ایک خالص انگریز Placard اٹھائے جنگلے سے باہر کھڑا نظر آیا۔ ہمیں شبہ بھی نہ ہوا کہ ہمارے لیے انگریز ڈرائیور بھی آ سکتا ہے۔ جنگلے سے باہر نکلے تو ڈرائیور نے فوراً سامان کی گاڑی سنبھال لی۔ ہم دونوں اپنے آپ کو معزز سمجھنے لگے۔ سڑک پار کر کے ہم پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ ڈرائیور صاحب نے سامان لوڈ کیا۔ ہمیں Cro... ہسپتال سے تھوڑی دُور ایک دومنزلہ مکان کی اُوپر والی منزل میں لے گیا۔ کسی سفید فام انسان سے پہلی بار سوٹ کیس اور بیگ اُٹھوائے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ یوسفی صاحب آ گئے۔ ہمارے پاس سرِدست اُن کی تواضع کے لیے تھا۔ میں نے فریج میں دیکھا تو چند جوس پڑے تھے۔ یہاں سے ایک جوس نکال کر یوسفی صاحب کو پیش کیا۔

اُن کے گھٹنے کے ساتھ ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اب انہوں نے اسے مجھے دے کر کہا "اس میں کچھ بچی رسد ہے ...ڈی، مکھن، چینی سب موجود ہے..... لیکن میں دوبارہ یہ مہربانی نہ کرسکوں گا۔ یہ لندن ہے۔ یہاں ساری Gro... خود لانا پڑتی ہے۔ واشنگ اور ووکنگ کرنے کے لیے کوئی ملازم نہیں ہوتا۔"

مشرق میں تو لوئر مڈل کلاس میں بھی کپڑے دھونے برتن مانجھنے کے لیے عورت مل جاتی ہے۔

یوسفی صاحب بولے "قریب ہی ٹیوب سٹیشن ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہیں ٹرین سے جاسکتے ہیں۔ ویسے تو ...پ بھی قریب ہے/اب آپ کو کار بھی نہیں دی جاسکتی کیونکہ یہ "ہوم" ہے اور اس کی مراعات سب کے لیے ایک سی

یوسفی صاحب ہمیں مغرب کی سب سے بڑی قدر Self-reliance ہاتھ میں پکڑا کر چلے گئے۔ ہم لوگ ...یں کے عادی ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے پر ایستادہ اور راستہ پوچھنے والے لوگ تھے۔ پھر خاں صاحب جو سفر کے ...ے میں تاک ضرور تھے لیکن ایک بیمار عورت کے ساتھ پر کچھ اُڑے اُڑے سے لگتے تھے۔ اسی روز جاوید عبداللہ ...ے پاس آئے۔ وہ ہمیں ٹیوب سٹیشن دکھانے لے گئے۔

ٹیوب کا کمال بھی انسانی پھرتی کا ٹیسٹ تھا۔ بس یہ منٹوں کے لیے رُکتی اور جھٹا پٹ روانہ ہوجاتی۔ ایسی تیزی ...ی کچھ مجھے پریشان کرگئی۔ اس ٹیوب پر دوسرے تیسرے دن سوار ہونے کا اتفاق ہوا اور ساتھ ہی دہشت گردی کا ...ر آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی ہم سٹیشن پر پہنچے ہی تھے کہ سرپھرا نوجوان بندوق لے کر کہیں سے برآمد ہوا اور دائیں ...ے ٹھا ٹھا گولیاں داغ دیں۔ بچے اور عورتیں بدحواس ہوکر تتر بتر ہوگئیں۔ جونہی ٹیوب آئی اور ہم سوار ہوئے۔ جناب ...ت گرد بھی بندوق لے کر سیڑھیاں چڑھ آئے۔ ٹکٹ چیکر غالباً ایسے سرپھروں کا عادی تھا۔ وہ شانتی سے کھڑا رہا۔ ...ت گرد نے بندوق تانی اور سیٹوں پر بیٹھے مسافروں کو کافی پریشان کیا۔

پہلے ہی دن جاوید عبداللہ کے علاوہ نعیم ہمیں ملنے آیا۔ آپ عمر بکری کے نام سے تو غالباً واقف ہیں۔ عمر بکری ...ڑوں کا رسیا تھا۔ اس کا ذکر خاں صاحب کے "سفر در سفر" میں تفصیل سے موجود ہے۔ میرے بھائی ریزی اور عمر بکری ...ں عمر پہاڑوں کے رسیا رہے۔ نعیم اُن ہی عمر بکری کے داماد تھے اور لندن میں رہتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا